دارالافتاء افکارِرضا
DARUL IFTA AFKAR-E-RAZA
+923169168614

رسالہ نمبر: 2　　　　تاریخ: 13-10-2024

من لم یعرف اهل زمانه فهو جاهل (جو اپنے زمانے والوں سے نا آشنا ہو وہ جاہل ہے۔)

علامہ قاضی عیاض مالکی، امام اجل ابوزکریا نووی شافعی شارحان صحیح مسلم پھر عارف باللہ سیدی عبدالغنی نابلسی حنفی شارح طریقہ محمدیہ فرماتے ہیں: خروجه عن العادة شهرة ومكروه۔ عادت اور عرف کی خلاف ورزی مکروہ اور باعث شہرت ہے۔ (فتاوی رضویہ)

العطية الإلهيّة في اثبات خصوصية "السيد" لسلالة الفاطميّة

(سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنھا کی اولاد کے لیے "سید" لفظ کی خصوصیت کو ثابت کرنے میں عطیہ خداوندی)

تحقیق: افکارِ رضا ریسرچ سینٹر

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ خود "رب العالمین" ہے، تو اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو "رحمۃ للعالمین" کا لقب عطا کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کو ایمان کی بنیاد بنایا۔ اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اپنی محبت قرار دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنی اطاعت کا درجہ عطا فرمایا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہر چیز کو خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے، چاہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثارِ مبارکہ ہوں، موئے مبارک ہوں، یا آپ کے اہلِ بیت یعنی آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ بالخصوص آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعت میں انتہائی احترام اور محبت کا مقام دیا گیا ہے۔ اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت سے محبت کو ایمان کا حصہ بنایا اور فرمایا: "﴿قُلْ لَّاۤ اَسْــٴَـلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰىؕ﴾" ترجمہ کنزالایمان: تم فرماؤ میں اس پر تم سے کچھ اجرت نہیں مانگتا مگر قرابت کی محبت۔
(پارہ 25، سورۃ الشوریٰ، آیت 23)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں، یعنی آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کو امت پر لازم قرار دیا ہے۔ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ان کی نسبت کی وجہ سے ہے، جو براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑی ہوئی ہے، تو ان سے محبت اور تعظیم در حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تعظیم ہے۔ یہ نسبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آل کو ایک ایسی خصوصیت عطا کرتی ہے، جو ہر مسلمان کے دل میں محبت و احترام کا باعث ہے اور ان کی عظمت کو پہچاننا دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اعتراف ہے۔

اسی محبت و عظمت کے پیش نظر امت مسلمہ کے مختلف علاقوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فاطمی اولاد کو مختلف محبت بھرے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کے ذریعہ سے یہ لوگ، دیگر لوگوں

سے ممتاز شمار ہوتے ہیں، بالخصوص پاک و ہند میں اس کے لیے عمومی لفظ "سید" استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال عام طور پر اُن افراد کے لیے ہی کیا جاتا ہے، جو نسباً اہل بیت اطہار، خاص طور پر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنھا کی اولاد سے منسوب ہوں۔ لفظ "سید" عربی و اردو زبان میں سردار یا قائد کے معنوں میں بھی آتا ہے، مگر ہمارے عرف میں جب یہ مطلقاً بولا جائے، تو اس سے یہی خاص معنی یعنی فاطمی اولاد مراد ہوتی ہے۔ اور جب اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان، اولادِ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالی عنھا کے ساتھ خاص طور پر استعمال کیا جاتا ہے، تو اس کا مفہوم نہایت مقدس اور محترم ہو جاتا ہے۔ تاریخ اسلام میں اس لقب کا استعمال ان لوگوں کے لیے ہوتا آیا ہے، جو اپنے نسب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے سے جڑے ہیں۔ تاہم یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ سید لفظ کا یہ استعمال محض ایک لقب یا تعظیم کے اظہار کے طور پر نہیں، بلکہ ایک عظیم نسبت کا آئینہ دار ہے، جو امت کے دلوں میں آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و عقیدت کو مزید گہرا کرتی ہے۔

اس رسالے میں ہم اس لفظ کی نسبت و خصوصیت سے متعلق چند سوالات کا جائزہ لیں گے کہ آیا لفظ "سید" کا استعمال صرف اولادِ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالی عنھا کے ساتھ خاص ہونے کا قول درست ہے یا نہیں؟ اس کے لیے ہم نے پہلے بھی اپنے ایک فتوے اور مختصر رسالے میں فقہاء، مورخین اور اہل علم کی آراء اور روایات سے مفصل گفتگو کی ہے، مگر بعض لوگوں کو اس پر کچھ بے جا تشویش ہوئی اور ان کی طرف سے اس پر کچھ اعتراضات و اشکالات آئے ہیں، جن کے جواب کے لیے یہ چند جملے ترتیب دیے جا رہے ہیں، تاکہ اس معاملے کی حقیقت کو واضح کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کی پہچان اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین، بجاہ النبی الامین صلی اللہ تعالی علیہ وسلم۔

العطية الإلهيّة في اثبات خصوصية "السيد" لسلالة الفاطميّة

الحمدلله الذى جَلَّت قدرته عن الشبيهات، وتفرّد في جلاله عن المثيلات، والصلاة والسلام على سيد البريّات، خير من مشى على الأرض بالبركات، والهادى إلى الجنّات، وعلى آله وأصحابه ذوى العلياء والسعادات، مادامت الأرض والسماوات.

فإنَّ اللّٰه تعالى قد أكرمهم في كتابه المجيد، فقال: ﴿إنما يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذهِبَ عنكم الرّجسَ أهلَ البيتِ ويُطهِرَكم تطهيرا.﴾ واللّٰه العليمُ الحكيمُ، الرحمنُ الرحيمُ، الجوادُ الكريمُ، الذي لا يُخلفُ وعدًا، ولا يُردُّ دعاءً. وإنَّ نبينا محمدًا، صلى اللّٰه عليه وسلم، هو الهادى الراشد، الشفيع المشفَّع، الذي قادنا من الظلمات إلى النور، وهو مثالُ المتقين. فلنُعظم آل فاطمة، ونجعلهم قدوةً في إيماننا وسلوكنا، والحمدلله رب العالمين.

پسِ منظر:

کچھ عرصہ قبل ایک سائل کی طرف سے ہمارے پاس ایک پوسٹ آئی تھی، جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ (ضروری اعلان: "ہاشمی صرف سید ہوتے ہیں۔ ہر ہاشمی۔۔۔ ہاشمی نہیں ہوتا، یونہی ہاشمی امتی نہیں ہوتا، بلکہ سید ہوتا ہے، جو ہاشمی یہ کہے کہ میں صرف امتی ہوں، وہ جھوٹا تو ہو سکتا ہے، لیکن ہاشمی نہیں") تو اس پوسٹ کے حوالے سے آپ کیا فرماتے ہیں، یہ درست ہے یا نہیں؟

تو اس کا جواب ہماری طرف سے مع دلائل یہ جاری ہوا تھا کہ اس پوسٹ میں لکھی گئی باتیں درست نہیں ہیں، بلکہ کئی اعتبار سے باطل و مردود ہیں، جن کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

بنو ہاشم یعنی ہاشمی سے مراد ایسے لوگ ہیں، جو حضرت علی و جعفر و عقیل اور حضرت عباس و حارث

بن عبد المطلب کی اولاد سے ہیں، جبکہ "سید" صرف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فاطمی اولاد کو کہا جاتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ قرونِ اولی میں سید یا شریف کا اطلاق تمام بنو ہاشم (یعنی حضرتِ علی و جعفر و عقیل و حضرت عباس اور حارث بن عبد المطلب رضی اللہ تعالی عنھم کی اولاد) پر ہوتا تھا، مگر بعد کے ادوار میں سید اور شریف کے الفاظ کو خاص حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فاطمی اولاد کے لیے بولا جانے لگا اور ہمارے پاک وہند کے عرف میں اب تک سید لفظ انہی ہستیوں کے لیے بولا جاتا ہے اور انہی کو آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے۔ لہذا اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ہاشمی، صرف سید نہیں ہوتا، بلکہ سیدوں (حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فاطمی اولاد) کے علاوہ جو حضرت علی و جعفر و عقیل اور حضرت عباس و حارث بن عبد المطلب کی اولاد ہو، وہ بھی ہاشمی ہوتی ہے۔

یونہی یہ کہنا کہ "ہر ہاشمی۔۔۔ ہاشمی نہیں ہوتا" یہ بھی ایک بے معنی و مہمل بات ہے، کسی بھی عاقل شخص پر مخفی نہیں کہ ہاشمی، ہاشمی ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ "ہاشمی امتی نہیں ہوتا، بلکہ سید ہوتا ہے" تو یہ بھی ایک مہمل سا تقابل ہے کہ امتی اور سید ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ امتی ایک عمومی اصطلاح ہے، جس میں مسلمانوں کی ہر قوم، لقب، نسب وغیرہ کے افراد شامل ہوتے ہیں، تو سیدوں کو امتی سے خارج کرنا، درست نہیں۔ ایسے ہی یہ کہنا کہ "جو ہاشمی یہ کہے کہ میں صرف امتی ہوں، وہ جھوٹا تو ہو سکتا ہے، لیکن ہاشمی نہیں۔" یہ بھی غیر مستند، ناقابلِ اعتبار اور بے وقوفانہ بات ہے کہ ہاشمی امتی نہیں ہوتا، تو وہ کیا ہوتا ہے؟ ہاشمی، سید بمعنی مصطلحِ خاص نہیں ہوتا، جیسا کہ ماقبل گزرا ہے کہ وہ عام ہے اور سید خاص ہیں، لہذا ہر سید ہاشمی ہو گا، مگر ہر ہاشمی سید ہو، یہ ضروری نہیں۔ اور جو صرف ہاشمی ہو اور سید نہ ہو، تو اس کا خود کو امتی کہنا اگر از قبیل امتِ مصطفی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم ہو، تو اس کی صداقت میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور اگر خود کو سیدوں کی فہرست سے خارج کرنے کا معنی مراد ہو، تو بھی یہ درست ہے، لہذا اس پوسٹ والے کا اسے جھوٹا کہنا، خود اس پوسٹ کرنے والے کے جھوٹے، کذاب اور مفتری ہونے پر دال

ہے۔

بہر حال اگر اس پوسٹ کا مقصد محض ہاشمیوں کو عرفِ حال کے مطابق سید ثابت کرنا ہے، تو یہ بلکل باطل و مردود ہے کہ ہمارے عرف میں سید سے مراد آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے ہیں، جو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فاطمی اولاد ہیں، تو اس لحاظ سے دیگر ہاشمی، سیدوں کی فہرست سے خارج ہوتے ہیں۔اس کے باجود اگر کوئی دھوکہ دہی کرتے ہوئے، اپنا نسب بدلے، تو وہ اس وعید کو جان لے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اپنے آپ کو کسی ایسی قوم کی طرف منسوب کیا، جس میں اس کا نسب نہیں، تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

لفظِ سید کی تخصیص کے دلائل (مختصرا):

الحاوی للفتاوی اور فتاوی حدیثیہ وغیرہ کتب میں ہے: واللفظ للثانی "اعلم ان اسم الشريف كان يطلق في الصدر الاول على من كان من اهل البيت ولو عباسيا او عقيليا ومنه قول المؤرخين: الشريف العباسي، الشريف الزينبي؛ فلما ولى الفاطميون بمصر قصروا الشرف على ذرية الحسن والحسين فقط واستمر ذلك إلى الآن "ترجمہ: جان لو! بے شک صدر اول میں لفظِ شریف (اسی طرح پاک وہند میں سید کا لفظ) مطلقا اہلِ بیت پر بولا جاتا تھا، چاہے وہ عباسی ہوں یا عقیلی ہوں۔اسی سے مؤرخین کا یہ قول ہے کہ عباسی شریف، زینبی شریف، پھر جب فاطمی مصر پر والی ہوئے، تو انہوں نے شریف یعنی سید کا لفظ صرف امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی اولاد کے ساتھ خاص کر دیا گیا اور اس وقت سے لے کر، ابھی تک ویسا ہی چل رہا ہے۔

(الفتاوی الحدیثیہ، صفحہ 121، دار الفکر، بیروت)

اعلی حضرت امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمن لکھتے ہیں: "شیخ کسی خاص قوم کا نام نہیں، ہندوستان میں مسلمانوں نے تین قومیں خاص شریف قرار دیں اور انہیں سید یا میر اور خاں اور بیگ کے خطاب دیے

کہ ان سب لفظوں کے معنی عربی وفارسی وترکی میں سردار ہیں، باقی تمام شرفاء مثل اولاد امجاد خلفائے کرام وبنی عباس وانصار کو ایک لقب عام دیا، شیخ کہ یہ بھی بمعنی بزرگ ہے، ان کے سوا جو قومیں رہ گئیں کہ دنیاوی عرف میں رذیل سمجھی جاتی ہیں، انہوں نے جب دیکھا کہ میر وخادم وبیگ تو خاص خاص اقوام کے لقب ہیں، ان میں گنجائش نہیں اور شیخ ایک عام لفظ ہے جس میں باقی سب داخل، تو اسی کو سمائی والا خطاب پاکر سب قوموں نے اپنی بھرتی اسی میں کردی۔" (فتاوی رضویه، جلد11، صفحه719، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

فتاوی رضویہ میں ہے: "سبطین کریمین (حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما) کی اولاد سید ہیں۔"
(فتاوی رضویه، جلد13، صفحه361، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

فتاوی اہلسنت (کتاب الزکوۃ) میں ہے: "حضرت علی کرم اللہ تعالی وجہہ الکریم کی جو اولاد حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا سے ہے، ان کو اور حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی اولاد کو سید کہا جاتا ہے، ہر سید ہاشمی ضرور ہے، مگر ہر ہاشمی سید ہو، یہ ضروری نہیں۔"
(فتاوی اهلسنت، صفحه425، مکتبة المدینة، کراچی)

بخاری شریف میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: "ليس من رجل ادعى لغير ابيه وهو يعلمه الا كفرومن ادعى قوما ليس له فيهم نسب فليتبوأ مقعده من النار" ترجمہ: جس شخص نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو اپنے والد کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف منسوب کیا، تو اس نے کفر کیا اور جس نے اپنے آپ کو کسی ایسی قوم کی طرف منسوب کیا، جس میں اس کا نسب نہیں، تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔
(صحیح البخاری، جلد04، صفحه180، المطبعة الکبری الامیریة، بیروت)

کتابوں میں اس مسئلہ پر بیسیوں دلائل موجود ہیں، مگر اختصار کے پیشِ نظر انہی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

ضروری وضاحت:

اس فتوی کو جاری کرنے کے بعد سائل نے ہمیں ہاشمیوں کے لیے لفظِ سید کے جواز پر چند صفحات کا

ایک رسالہ بھیجا، جس میں سید کے لغوی اطلاقات سے یہاں کے عرفِ خاص کا ناکام رد کرنے کی کوشش کی گئی تھی، تو بفضلِ خدا، اس رسالہ کا جواب بھی "القول الفائق برد فتوی الشائق" کے نام سے لکھا گیا تھا، جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ لفظِ سید کا مطلقاً بغیر اضافت کے استعمال ہمارے عرف میں حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنھا کی اولاد کے ساتھ خاص ہے، تو اگر کوئی خود کو مطلقاً سید کہہ کر اس سے ہاشمی مراد لیتا ہے، تو اس کا یہ عمل درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں دھوکہ، نسب کی تبدیلی کی طرف توہمات اور جاہل ناہنجار لوگوں کو نسب کی تبدیلی پر جری کرنا ہے، علاوہ ازیں یہ ہمارے عرف کے بھی خلاف ہے، تو لوگ اس پر چہ می گوئیاں کریں گے۔ اور اس پر کئی دلائل و نظائر قرآن و حدیث سے دیئے گئے تھے، جن میں سے بعض آگے ذکر کئے جائیں گے۔ اور اگر مطلق نہ ہو، بلکہ کسی اضافت کے ساتھ ہو، جس سے اوپر ذکر کردہ توہمات وغیرہ زائل ہوں، تو اس میں حرج نہیں۔ مگر اس کے بعد اسی رسالے کے مصنف کی طرف سے ہمارے اس رسالے کا بھی رد لکھا گیا ہے، جس کے رد الرد میں اب یہ جواب مرتب کیا جا رہا ہے۔

عرف وتعامل کی شرعی حیثیت:

اس بات میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ پاک و ہند میں "سید" کا لفظ جب بغیر کسی سیاق وسباق کے مطلقاً استعمال ہو، تو اس سے مراد آلِ رسول، اولادِ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنھا ہی ہوتی ہے۔ اس پر کسی کو کوئی شک ہو، تو وہ اپنے ارد گرد چند مختلف جگہوں پر لوگوں سے پوچھ کر دیکھ لے، تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ اس پر صریح عرف موجود ہے۔ اسی طرح علمائے کرام کی کتابوں میں اس پر واضح نصوص بھی موجود ہیں۔

اس تفصیل کے بعد کہ یہ لفظ عرف میں ایک خاص نسبت و قوم کے ساتھ خاص ہو چکا ہے، یہاں ذیل میں عرف وتعامل کے دلائل شرعیہ میں سے ہونے پر مفتی نظام الدین صاحب کے لکھے گئے دلائل کی

ایک جھلک التقاطاً ملاحظہ فرمائیں۔اس کے بعد معترض کے اشکالات کے جوابات دیئے جائیں گے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

شریعت طاہرہ کے دلائل دو طرح کے ہیں:

کچھ وہ دلائل ہیں، جن کا حجت ہونا کسی حال، یا مقام کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر حال اور ہر مقام میں وہ دلیل و حجت قرار پاتے ہیں۔ یہ دلائل چار ہیں:

(1) کتاب اللہ (2) سنت رسول اللہ (3) اجماع (4) قیاس

اور کچھ دلائل وہ ہیں جن کا حجت شرعیہ ہونا، کسی حال و مقام کے ساتھ خاص ہوتا ہے کہ وہ حال اور مقام پایا جائے تو یہ حجت بنتے ہیں، ورنہ نہیں۔ یہ دلائل سات ہیں، جنہیں ایک جامع لفظ کے ذریعہ چھ میں سمیٹ کر اسباب ستہ" بھی کہا جاتا ہے۔

(1) ضرورت (2) دفع حرج (3) عرف (4) تعامل (5) دینی ضروری مصلحت کی تحصیل (6) کسی فساد موجود یا مظنون بظن غالب کا ازالہ۔ ہم یہاں اختصار کے پیش نظر عرف و تعامل کے مقالات اور مباحثے پر روشنی ڈالتے ہیں:

عرف اور تعامل کے احکام کے لیے شرعی دلیل ہونے پر شک کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ قرآن عظیم بھی مطابقت عرف پر اترا۔ چنانچہ اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے:﴿اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَاۤ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ﴾ ترجمہ کنزالایمان: بے شک وہ حق ہے اس کے مثل جو تم بولتے ہو۔ (پارہ 26، سورۃ الذاریات، آیت 23)

اس کی زیادہ تفصیل کتاب "فقہ اسلامی کے سات بنیادی اصول" میں ہے۔ تاہم، یہاں چند بنیادی دلائل اختصار کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں کہ کہاں کہاں عرف و تعامل معتبر ہے اور کہاں کہاں معتبر نہیں:

وہ امور (1) جو شریعت کے بتانے سے ہی ہمیں معلوم ہوئے، عقل ان کی تعیین سے قاصر ہے۔ یا (2) شریعت نے کوئی خاص وضع وہیئت متعین فرمادی، یا (3) کچھ خاص اذکار، خاص مقاصد کے لیے تعلیم

فرمائے۔ ان میں عرف ناس کا اعتبار نہ ہو گا، یہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔ فقیہ امت، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان نے اس خصوص میں بڑی تحقیقی اور جامع گفتگو فرمائی ہے، جس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ صرف درج بالا تین امور عرف وعادت کے دائرۂ اثر سے باہر ہیں اور ان کے سوا عبادات کی تمام صورتیں، ان کے دائرہ اثر میں آتی ہیں۔ آپ رقم طراز ہیں:

(1) وہ امور جن کی طرف عقل کو ابتدا نہیں، مثل تعیین اوقات وعدد رکعات و ترتیب افعال و وحدتِ رکوع وتعدد سجدات اور تحدیدِ نصاب و مصرفِ زکاۃ اور وقت و مکانِ وقوف اور مطاف وعددِ اشواط سعی وطواف وغیرہا قطعاتوقیفی (یعنی) شریعت کے بتانے پر موقوف ہیں۔

(2) یوں ہی وہ اوضاع وہیئات کہ شارع نے ایسے امور میں محدود و معین فرمائے اور مجملات کتاب کے بیان واقع ہوئے، جن کی تعیین کی طرف امثالِ صَلُّوا کَمَارَأَيتُمُونِي أَصلی (نماز پڑھو جیسا کہ مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔) نے اشارہ فرمایا۔

(3) اسی طرح وہ اذکار وافعال مخصوصہ کہ اوقات خاصہ پر غایات و مقاصد معینہ کے لیے علی وجہ التعیین مقرر ہوئے اور مکلفین ان کی طرف مطلقات و عمومات سے دعوت نہ کیے گئے۔ جیسے تکبیر تحریمہ، و تحلیل نماز و تشہد واذان واقامت وغیرہا۔یہی وہ اشیاہیں جنھیں توقیفی کہا جاتا ہے۔

(4) ان کے سوا باقی تمام امور جن میں نصاًو دلالۃً شرعِ مطہر سے تحدید وحظر اور توقیف و حجر ثابت نہیں۔ اگر چہ وہ انہیں توقیفیات سے علاقہ رکھتے ہوں، ان میں بھی توقیفِ (شارع کے بتانے) پر توقف نہیں، اگر چہ بوجہ تعلق توقیفی وقوف اولی ہو، لہذا دعائے قعدۂ اخیر صرف الفاظِ وارده پر مقصور نہیں، ہر شخص جو چاہے دعا کر سکتا ہے۔ بعد اس کے کہ کلام ناس سے مشابہ نہ ہو۔ اسی طرح عیدین وغیرہا کے خطبے خصوصا، خطبہ جمعہ کہ شرطِ صحتِ نماز ہے، ان میں الفاظ مرویہ پر اقتصار نہیں۔

یہ صورتِ چہارم اعنی متعلقات بلکہ بعض افراد صورتِ سوم بھی انظار مجتہدین کے جولانگاہ ہیں۔

بعض نے ان میں کسی کو قسم اول سے خیال فرمایا اور وقوف لازم ٹھہرایا، اور بعض نے قسم دوم سے سمجھا اور رخصت کا حکم بتایا، ورنہ، نہ قسم اول میں ارسال و اطلاق معقول، نہ دوم میں، جہاں شرع نے اطلاق کو کام فرمایا تحدید و تقیید نامقبول۔ہاں کسی سنت ثابتہ کو اٹھادینا، کوئی نیا امر مزاحم و مراغمِ سنت پیدا کرنا کسی حال روا نہیں۔

اس تفصیل سے یہ امر مستفاد ہوتا ہے کہ عبادات میں جو امور توقیفی نہیں ہیں، ان میں عرف ناس معتبر ہے۔بس شرط یہ ہے کہ وہ عرف کسی سنت ثابتہ کے خلاف نہ ہو۔

دلائل وشواہد:

(1) اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ ترجمہ: ہم کو سیدھا راستہ چلا راستہ اُن کا جن پر تُونے احسان کیا۔ (پارہ 01، سورۃ الفاتحۃ، آیت 05۔06)

اس آیہ کریمہ میں "صراط مستقیم" سے "طریق مسلمین" مراد ہے۔ چنانچہ مفسر قرآن حضرت علامہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ تعالی علیہ فرماتے ہیں: لا خفاء فیہ أن الطریق المستقیم ما یکون طریق المومنین "ترجمہ: بلاشبہ صراط مستقیم "مومنوں کی راہ ہے۔

(تفسیر البیضاوی، جلد 01، صفحہ 30، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

تفسیر خزائن العرفان میں ہے: "صراط مستقیم" سے "طریق مسلمین" مراد ہے۔ جن امور پر بزرگان دین کا عمل رہا ہو، وہ صراط مستقیم میں داخل ہے۔"

(کنز الایمان مع تفسیر خزائن العرفان، صفحہ 03، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

اور مسلمانوں کا تعارف و تعامل بلاشبہ طریق مسلمین ہے، جس کے عموم میں عبادات بھی یقینا داخل ہیں، جیسے اجماع، قیاس، استحسان طریق مسلمین ہیں اور عبادات میں بھی حجت تسلیم کیے جاتے ہیں۔

(2) حدیثِ پاک میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عن عبد اللہ قال:

«ما رأى المسلمون حسنا فهو عند الله حسن، وما رآه المسلمون سيئا فهو عند الله سيء "ترجمہ: مسلمان جس چیز کو اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور مسلمان جسے بری سمجھیں، وہ اللہ کے نزدیک بھی بری ہے۔

(المستدرک علی الصحیحین، جلد 03، صفحہ 83، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حلیۃ الاولیا کے الفاظ یہ ہیں: فما رأه المؤمنون حسنًا فهو (عند الله) حسن وما رأه المومنون قبيحا فهو عند الله قبيح "ترجمہ: جس کام کو اہل ایمان حسن جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی حسن ہے اور جس کام کو اہل ایمان قبیح جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی قبیح ہے۔

(حلیۃ الاؤلیاء وطبقات الاصفیاء، جلد 01، صفحہ 375، مطبعۃ السعادۃ، مصر)

اور ہدایہ صفحہ: 287، جلد 3، باب الاجارۃ الفاسدۃ میں ہے کہ یہ بات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی۔ ایسا ہی بدائع الصنائع جلد اول صفحہ: 148 مطبع بیروت نیز صفحہ: 367، بحث تثویب میں بھی ہے۔

اس حدیث پاک میں "ما" کا لفظ عام ہے جس کے افراد میں معاملات کے ساتھ ساتھ عبادات بھی شامل ہیں۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ صاحب ہدایہ نے یہ حدیث معاملات کے ایک مسئلے میں اور صاحب بدائع نے عبادات کے ایک مسئلے میں تعامل کی حجیت کے ثبوت میں پیش کی ہے۔ حجۃ الخلف، تاج المحققین علامہ مفتی محمد تقی علی خان قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالی علیہ کتاب مستطاب " اصول الرشاد "میں فرماتے ہیں:

" تعامل جس طرح معاملات میں حجت ہے، اسی طرح عبادات میں بھی معتبر ہے کہ لفظ "ما" اثرِ ابن مسعود اور سبیل المُؤمِنِینَ کریمہ اور اتبعوا السواد الأعظم حدیث دونوں طرح کے احکام کو شامل۔ اور علما دونوں طرح کے احکام اس پر بنا کرتے ہیں کہ بعض ہم نے بھی ذکر کیے اور کوئی فارق عقلی و سمعی محقق

نہیں، تو تخصیص اس کی معاملات کے ساتھ محض بے معنی ہے۔

(اصول الرشاد لقمع مبانی الفساد، صفحہ 177-178، مکتبہ برکات المدینہ، کراچی)

ان دلائل سے عبادات کی ہر قسم میں عرف وعادت کا معتبر ہونا، ثابت ہوتا ہے۔

(3) عبادات کی نوع اول میں سب سے اہم عبادت نماز ہے، جو بلا شبہ توقیفی ہے اور "قرأت" نماز کے اہم ارکان سے ہے، جو بالا جماع فرض ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ تم قرأت کرو جو قرآن سے آسان ہو۔ (پارہ 29، سورۃ المزمل، آیت 20)

مگر یہ قرأت کتنی مقدار فرض ہے، اس کا تعین عرف ناس سے کیا گیا ہے، یعنی کم سے کم کتنی مقدار قرأت کرنے والے کو عرف میں "قاری قرآن" کہا جائے، امام اعظم علیہ الرحمہ کا موقف ہے کہ یہ مقدار ایک آیت ہے اور صاحبین رحمہما اللہ تعالی تین آیات بتاتے ہیں۔ جیسا کہ امام ابن الہمام رحمہ اللہ تعالی نے فتح القدیر میں اس کی صراحت فرمائی، جس کی وضاحت اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے الفاظ میں یہ ہے:

أقول: تقريره: أن الإمام وصاحبيه رضى الله تعالى عنهم اختلفوا في فرض القراءة، فقالا: ثلث قصار، أو أية طويلة ما يعدل ثلثا، لأنه لا يسمى فى العرف قاريا بدونه، وقال: بل أية، فإنها إذا كانت كذلك عد قاريا عرفا، بخلاف مادون الآية. فالخلاف بين الإمام وصاحبيه مبنى على الخلاف في قيام العرف في عده قاريا بالقصيرة، قالا: لا وهو يمنع، ملخصا۔ میں کہتا ہوں، اس کی تقریر یہ ہے کہ امام اعظم اور آپ کے صاحبین قاضی امام ابو یوسف و امام محمد رحمھم اللہ تعالی کے درمیان فرض قرأت کی مقدار کے بارے میں اختلاف ہے۔ صاحبین رحمہما اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ فرض تین چھوٹی آیات ہیں، یا ایک بڑی آیت جو تین چھوٹی آیتوں کے برابر ہو، کیونکہ عرف میں اس سے کم پڑھنے والے کو قاری قرآن نہیں کہا جاتا۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ فرض ایک آیت ہے، کیونکہ جب کوئی شخص

آیت کی مقدار تلاوت کرتا ہے، تو اسے عرفاً قاری قرآن کہا جاتا ہے، اس کے بر خلاف ایک آیت سے کم پڑھنے والے کو عرف میں قاری قرآن نہیں کہا جاتا۔

تو امام اعظم اور آپ کے صاحبین کے اختلاف کی بنیاد اس امر پر ہے کہ ایک چھوٹی آیت پڑھنے والے کو "قاری قرآن" کہنے کا عرف ہے یا نہیں۔ صاحبین فرماتے ہیں: "نہیں ہے" اور امام اعظم فرماتے ہیں کہ: "اس کا عرف ہے۔" امام اعظم اور صاحبین کے درمیان اختلاف کا سبب یہ ہے کہ اس باب میں نزول قرآن کے وقت کا عرف معتبر ہے، اور وہ عرف کیا تھا، اس کے بارے میں ان بزرگوں کو مختلف روایات پہنچیں اور ظاہر یہ ہے کہ جو روایت امام اعظم کو پہنچی وہ صاحبین کو نہ پہنچ سکی، اس لیے ترجیح مذہب امام کو ہے۔

(4) نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں، ناف کے نیچے، یا سینے کے نیچے۔ اس کی بنیاد فقہانے عرف پر رکھی ہے، جیسا کہ فتح القدیر کے درج ذیل جزئیہ سے عیاں ہے: وکونه تحت السرة أو الصدر كما قال الشافعي لم يثبت فيه حديث يوجب العمل فيحال على المعهود من وضعها حال قصد التعظيم في القيام، والمعهود في الشاهد منه تحت السرة. اھ) ترجمہ: نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھا جائے یا بقول امام شافعی سینے کے نیچے؟ اس بارے میں کوئی ایسی حدیث ثابت نہیں، جس پر عمل واجب ہو، لہذا قیام تعظیمی میں جہاں ہاتھ باندھنا، معہود و متعارف ہے، وہیں ہاتھ باندھا جائے اور اس بارے میں معہود یہ ہے کہ بڑوں کے دربار میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھتے ہیں، ملتقطا۔

(جدید مسائل پر علماء کی رائیں اور فیصلے ملتقطا، جلد 01، صفحہ 49 تا 54، مجلس شرعی، ھند)

اسی طرح شامی میں ہے: "ان المعتبر فی احکام الشرع العرف" ترجمہ: احکامِ شرع میں بہر حال عرف کا اعتبار ہے۔ **(ردالمحتار، جلد 02، صفحہ 453، داراحیاء التراث العربی، بیروت)**

اسی طرح فتاوی رضویہ میں ہے: "اسی طرح اقوال ائمہ میں بھی ہوتا ہے (کہ ان کے حکم صوری کے

خلاف کوئی حکم ضروری پالیا جاتا ہے) اس کے درج ذیل اسباب پیدا ہوتے ہیں (1) ضرورت (2) حرج (3) عرف (4) تعامل (5) کوئی اہم مصلحت جس کی تحصیل مطلوب ہے (6) کوئی بڑا مفسدہ جس کا ازالہ مطلوب ہے۔ یہ اس لئے کہ صورتوں کا استثنا، حرج کا دفعیہ، ایسی دینی مصلحتوں کی رعایت جو کسی ایسی خرابی سے خالی ہوں، جو ان سے بڑھی ہوئی ہے، مفاسد کو دور کرنا، **عرف کالحاظ کرنا، اور تعامل پر کار بند ہونا، یہ سب ایسے قواعد کلیہ ہیں جو شریعت سے معلوم ہیں**، ہر امام ان کی جانب مائل ان کا قائل اور ان پر اعتماد کرنے والا ہی ہے۔ اب اگر کسی مسئلے میں امام کا کوئی صریح حکم رہا ہو، پھر حکم تبدیل کرنے والے مذکورہ امور میں سے کوئی ایک پیدا ہو، تو ہمیں قطعا یہ یقین ہو گا کہ یہ امر اگر ان کے زمانے میں پیدا ہوتا، تو ان کا قول اس کے تقاضے کے مطابق ہی ہوتا، اسے رد نہ کرتا اور اس کے بر خلاف نہ ہوتا، ایسی صورت میں ان سے غیر منقول قول ضروری پر عمل کرنا ہی در اصل ان کے قول پر عمل ہے، ان سے نقل شدہ الفاظ پر جم جانا ان کی پیروی نہیں۔"

(فتاوی رضویہ، جلد 01، صفحہ 126، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مکتبۃ المدینہ کی مطبوعہ کتاب "فیضان فاروق اعظم" میں ہے: "عرف کا معاشرے میں بہت بڑا دخل ہے، احکام شرعیہ کا ایک بڑا حصہ عرف سے تعلق رکھتا ہے، جو حاکم اپنے علاقے کے عرف سے واقف نہ ہو، یقیناً وہ کسی صورت بھی کامیاب حاکم نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ سیِّدُنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود بھی مفتوحہ علاقوں کا دورہ فرماتے، تاکہ وہاں کے عرف وعادت کو جان سکیں اور اپنے گورنروں وعمالوں سے بذریعہ خط وکتابت بھی اس معاملے میں معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔ حضرت سیِّدُنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے اکثر خط وکتابت فرماتے رہتے تھے۔"

(فیضان فاروق اعظم، جلد 02، صفحہ 712، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

استدلال:

مذکورہ بالا دلائل سے جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ شرع میں عرف کا اعتبار ہے اور احکام

شرعیہ کا ایک بڑا حصہ عرف سے تعلق رکھتا ہے، بلکہ مشہور مقولہ ہے کہ

من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل یعنی: جو اپنے زمانے والوں سے ناآشنا ہو وہ جاہل ہے۔

تو اس لئے اہل زمانہ کے احوال جانے بغیر ان کے خلاف فتوی دینا، جہالت کی علامت ہے، لہذا اگر عرف کا اعتبار نہیں ہے، تو مذکورہ مسائل میں معترض کو چاہیے کہ وہ کوئی نیا مسئلہ نکال کر سامنے لائے۔ ذیل میں معترض کی طرف سے وارد شدہ اشکالات کا جواب پیش کیا جائے گا۔



اشکالات کے جوابات

تنبیہ: یہاں ذیل میں معترض کے اشکالات کا جواب دیا جائے گا اور اس کے قول کو "قولہ" کے ساتھ بیان کر کے "اقول" سے جواب دیا جائے گا۔

قولہ: 01

سخن اولین: "القول الفائق بر دفتوی الشائق"۔ یہ رسالہ کس نے لکھا مولف کا نام کہیں بھی درج نہیں۔ یہ ایک سوال کا جواب ظاہر کیا گیا ہے، مگر سائل کا نام نہیں لکھا گیا۔ سبحانک ھذا شئی عجیب، نہ سائل کا نام نہ مجیب مفتی کا نام اور بندہ کا لقب لکھ کر " من ھو السید " بندہ کے رسالہ کا رد کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ رؤس ثمانیہ علم معقول والوں نے فرمایا کتاب یا رسالہ میں 8 امور کا ذکر ہونا چاہیے۔ ان امور میں ضروری ہے کہ مولف مصنف کا ذکر ہو، تا کہ پتہ چلے وہ کون ہے؟

اقول:

محترم! رسالہ کے بالکل آغاز میں لکھا ہے کہ یہ رسالہ افکارِ رضا ریسرچ سینٹر کی جانب سے ہے اور اگر آپ کو کچھ معلومات اور عرفِ عام پر نظر ہو، تو ریسرچ سینٹرز میں عموما ایک سے زائد لوگ مل کر تحقیق و تصنیف کرتے ہیں، تو اس طرح کی کچھ وجوہات کی بناء پر مصنف و مؤلف کا نام نہیں، بلکہ ادارے کا نام لکھا جاتا ہے اور فی زمانہ اس کا بیسیوں اداروں کی سینکڑوں کتابوں میں نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ خیر آپ سے عرف و عادت کے احوال کا کیا شکوہ۔ جہاں اتنا بڑا "سید" لفظ کا عرف سمجھ میں نہیں آیا، تو یہ باریکیاں کہاں سمجھ آئیں گی۔ اس لئے آپ تسلی رکھیں کہ یہ ناکام نہیں، بلکہ کامیاب رد ہے۔ اور ادارے کا نام "افکارِ رضا ریسرچ سینٹر" ہے، جسے محترم سید کامران مدنی چلاتے ہیں، تو اداروں میں لوگ بدلتے رہتے ہیں، مگر ادارہ باقی رہتا

ہے۔لہذا آپ کے کسی بھی اشکال کا جواب ادارے کی جانب سے دیا جائے گا۔ادارے کے حوالے سے معلومات کے لیے سوشل میڈیا پیجز ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

قولہ:02

القول الفائق کے 8 صفحات: کسی صفحہ پر نہ کتاب اللہ کا حوالہ ہے، نہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب لفظ سید کی تخصیص اولا د فاطمہ کے لیے کتاب اللہ میں کسی جگہ نہیں، حدیث رسول میں نہیں، تو ایک مجہول شخص کو تخصیص کرنے کا اختیار کہاں سے حاصل ہو گیا؟

اقول:

یہ تخصیص کسی فردِ واحد کی جانب سے نہیں، بلکہ اس پر اہل سنت کی کئی کتب کے حوالہ جات کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے اور اولادِ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنھم کی مخصوص الفاظ سے تخصیص یہ صدیوں سے نہ صرف پاک وہند، بلکہ دنیا بھر میں رائج ہے۔ اور اس پر قرآن واحادیث سے بھی حوالہ جات موجود ہیں کہ ہمارے عرف میں سید سے مراد آلِ رسول ہوتے ہیں، جو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فاطمی اولاد ہے، تو اس لحاظ سے دیگر ہاشمی، سیدوں کی فہرست سے خارج ہوتے ہیں۔ اور سید کے لفظ کو یوں بغیر کسی وضاحت و سیاق کے دیگر ہاشمیوں کے لیے استعمال کرنا، ضرور لوگوں کے لیے موجبِ تشویش ہے کہ وہ اسے سید بمعنی اولادِ رسول سمجھیں گے، جبکہ یہ حضرت لغوی معنی کا اعتبار کر رہے ہیں، حالانکہ عوام کی بڑی تعداد اس کے لغوی معنی سے نابلد ہے، تو وہ اسے سید بمعنی خاص ہی سمجھیں گے، تو یہ ضرور عوام کو تشویش و فتنہ میں ڈالنے والی بات ہے، جبکہ شریعت میں فتنہ پھیلانے کی سخت مذمت کی گئی، حتی کہ اسے قتل سے بھی شدید کہا گیا ہے، چنانچہ قرآنِ مجید فرقانِ حمید میں ارشادِ باری تعالی ہے:

﴿وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِۚ﴾ ترجمہ کنزالایمان: اور ان کا فساد تو قتل سے بھی سخت ہے۔

(سورۃالبقرۃ191)

اس آیتِ مبارکہ کی رو سے بھی یہاں عامۃ الناس کو تشویش میں ڈالتے ہوئے، سید کے ہر ایک پر اطلاق کی اجازت نہیں ہو گی۔

اس کے باجود اگر کوئی غیرِ سید دھوکہ دہی کرتے ہوئے، خود کو سید یعنی آلِ فاطمہ میں سے ظاہر کرے، تو وہ اس وعید کو جان لے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اپنے آپ کو کسی ایسی قوم کی طرف منسوب کیا، جس میں اس کا نسب نہیں، تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

جب پاک وہند میں اس بات سے ہر عام وخاص آگاہ ہے کہ سید کا لفظ ہمارے عرف میں ایک خاص ذات ونسب کے حاملین کے لیے استعمال ہوتا ہے، تو اب جو شخص اس کے خلاف کا مرتکب ہو گا، تو وہ اگر کسی خاص سیاق سے اس کی نفی کر دے، تو فبھا، ورنہ وہ یہی نسب وذات کو بدلنے والا قرار پائے گا۔

نسب بدلنے کے متعلق بخاری شریف میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: "لیس من رجل ادعی لغیر ابیه وهو یعلمه الا کفرومن ادعی قوما لیس له فیهم نسب فلیتبوأ مقعده من النار "ترجمہ: جس شخص نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو اپنے والد کے علاوہ کی طرف منسوب کیا، تو اس نے کفر کیا اور جس نے اپنے آپ کو کسی ایسی قوم کی طرف منسوب کیا، جس میں اس کا نسب نہیں، تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

(صحیح البخاری، جلد04، صفحہ180، المطبعۃ الکبری الامیریۃ، بیروت)

خصوصا اس دور میں کہ جب جہلاء کی بہت بڑی تعداد نسب بدل دیتی ہے، بلکہ بہت سارے کھٹل قسم کے لوگ یہی کام کرتے ہیں کہ پہلے خود کو شاہ کہلواتے ہیں، پھر نام کے ساتھ سید لگا دیتے ہیں اور جب یہ اس سے مشہور ہو جاتے ہیں، تو اب یہ سب خود کو آلِ رسول کہہ کر پہچان کروا رہے ہوتے ہیں۔ تو یوں استعمال کی اجازت دے کر جاہلوں کے لیے گناہوں کا سامان کرنا ہے، جس کی شرعا کسی طور پر اجازت نہیں ہو سکتی، خصوصا جبکہ سید کا بمعنی آلِ رسول ہونا، صدیوں سے رائج ہے، تو اس میں عموم پیدا کرنا، ضرور عام

لوگوں کے لیے حرج و تشویش کا باعث ہے، جس سے احتراز لازم ہے۔

قولہ:03

لہذا جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ لفظ سید کا حصر ہے (یہ لفظ بند ہے) اولاد فاطمہ میں، تو سب سے پہلے وہ کتاب اللہ سے حوالہ پیش کریں۔ اگر کتاب اللہ میں کہیں "حصر" کا ذکر نہیں، تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حوالہ پیش کریں۔ اگر سنت رسول میں "حصر" نہیں، تو اجماع امت سے حوالہ پیش کریں۔ اگر اجماع امت میں بھی نہیں، تو پھر قیاس سے حوالہ پیش کریں، مگر جو قیاس اصول ثلاثہ سے مستنبط ہو۔ اس کی علت بھی معلوم ہو۔

اقول:

ماقبل میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ عرف و تعامل شرعی دلائل ہیں۔ اور یہ آپ کو بھی اچھی طرح علم ہے کہ پاک و ہند میں سید عام طور پر اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنھم کے بارے میں ہی استعمال ہوتا ہے، تو ایسے کسی موقع پر یوں خود کو سید ظاہر کرنا، لوگوں کے عرف کے خلاف اور انہیں دھوکہ دینے کے مترادف ہے، جس کی شرعا اجازت نہیں۔ اور اس موقع پر معترض کو یہ بھی چاہیے کہ وہ اپنا فقہی مذہب واضح کرے، تاکہ اسے ان کے امام کے اعتبار سے بھی جواب دے دیا جاتا، جبکہ احناف کے ہاں اس مسئلہ سے متعلق 5 نظیریں گزشتہ جواب میں بھی دی تھیں اور ان میں قرآن و حدیث کے حوالے تھے، مگر اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ ان مقامات پر یہ ممانعت کیوں ہے۔ یہ معترض جو اپنے آپ کو گویا مجتہد سمجھے بیٹھا ہے اس کو جان لینا چاہیے کہ ہمارے ہاں جب کسی شخص کے بارے میں مطلقاً کہا جائے کہ فلاں شخص سید ہے، تو سامنے والا فوراً یہی سمجھے گا کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فاطمی اولاد میں سے ہے۔ وہ اس کو کسی دوسرے معنی کی طرف نہیں لے کر جاتا ہے، کیونکہ یہی فاطمی اولاد والے معنی میں لفظِ سید گویا کے مطلق اطلاق میں خاص ہو چکا ہے۔ اور اس طرح کے عرف کا شرعا لحاظ رکھنا لازم ہے، جیسا کہ پیغمبر کا معنی پیغام رساں ہوتا ہے، مگر عرفِ

شرع میں یہ نبی کے ساتھ خاص ہے، تو اس لئے اب اگر کوئی اس پیغمبر کے لفظ کو پیغام رساں والے معنی میں استعمال کرے گا، تو اس صورت میں اس پر کفر کا حکم ہو گا، کیونکہ جب شرعا اس لفظ کی خاص معنی میں تخصیص ثابت ہو چکی، تو اب اس کا لحاظ لازم ہے اور خلاف کا اعتبار نہیں، اگرچہ لغوی معنی درست ہے، تو اب یہاں بھی سید بمعنی سردار، معزز، عظیم کے اگرچہ لغوی و معنوی اعتبار سے درست ہے، مگر یہاں چونکہ عرف اس کے خلاف ہو چکا ہے تو اب شرعی لحاظ سے ایسی تخصیص کی رعایت لازم ہے۔اس کے نظائر کو دوبارہ ملاحظہ فرمائیں:

کتبِ فقہ میں اس کے کثیر نظائر ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

1. حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قطعاً بے شمار غیوب و ماکان مایکون کے عالم ہیں، مگر عالم الغیب صرف اللہ عزوجل کو کہا جائے گا کہ یہ لفظ اس کے ساتھ خاص ہے۔
2. جس طرح حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قطعاً عزت و جلالت والے ہیں، تمام عالم میں ان کے برابر کوئی عزیز و جلیل ہے نہ ہو سکتا ہے، مگر محمد عزوجل کہنا جائز نہیں، بلکہ اللہ عزوجل و محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کہا جائے گا کہ یہ ایسے ہی معروف ہیں۔
3. یوں نہیں کہا جائے گا کہ حضرت ابو بکر صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا یا حضرت علی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، اس کا معنی اگرچہ صحیح ہے، مگر یہ الفاظ و انداز نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم یا دیگر انبیاء کرام کے لیے خاص ہے لہذا غیر نبی کے نام کے ساتھ یوں استقلالاً درود پاک نہیں پڑھا لکھا جائے گا، جیسا کہ محمد عزوجل نے کہا نہیں کہا جائے گا، اگرچہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام عزیز و جلیل ہیں؛ کیونکہ یہ اللہ پاک کے ذکر کا شعار ہے۔
4. یوں نہیں کہا جائے گا کہ ابو بکر غفر اللہ تعالی لہ نے کہا یا حضرت علی غفر اللہ لہ نے کہا، بلکہ رضی اللہ عنہ کہا جائے گا کہ یہ عرف کے خلاف ہے۔
5. حضرت موسی یا حضرت عیسی رضی اللہ عنہ نہیں کہا جائے گا، بلکہ صلوات اللہ تعالی وسلامہ

علیہ کہا جائے گا؛ کیونکہ یہ بھی خلافِ عرف ہے۔

6. قسم میں عرف کا اعتبار ہوتا ہے، دیکھو مچھلی کو قرآن کریم میں گوشت فرمایا: "لَحۡمًا طَرِیًّا" مگر فقہاء کرام قسم کے موقعہ پر اسے گوشت نہیں مانتے، جو شخص گوشت نہ کھانے کی قسم کھائے ،وہ مچھلی کھانے سے حانث نہیں ہوتا، کیوں؟ اس لیے کہ اسے عرف میں گوشت نہیں کہتے۔ اسی طرح عرف میں بولنے سے مراد ہوتا ہے، ظاہری سوال وجواب والا بولنا، مردے سے بولنے کو عرفاً بولنا، نہیں کہتے، اس لیے مردے سے کلام کرنے والا حانث نہیں ہوتا۔

(مرآۃ المناجیح، جلد 05، صفحہ 607، نعیمی کتب خانہ، گجرات)

7. جنازے کے لئے چارپائی، چادروں، غسل میت کے لئے گھڑوں اور لوٹوں کا وقف، اسی طرح اہل حاجت کے لئے کلہاڑی بسوے (برمہ یا درخت میں سوراخ کرنے کا اوزار) آرے اور پھاوڑے کا وقف، مسافروں کے لئے طشت، ہانڈی، بڑی دیگ کا وقف، مساجد کے لئے قندیل کی رسی، زنجیر کا وقف، قرآن مجید وکتب وغلہ وگاؤ (گائے) ودراہم ودنانیر کا وقف آٹے سے آٹا تول کر بیچنا نہ کہ ناپ سے، تول کر آٹا قرض لینا، روٹیوں کی گنتی سے بیع سلم، روٹیوں کا گن کر قرض لینا، اموال ستہ ربویہ میں کیل ووزن کا عرف بدلنے پر امام ابو یوسف کا اعتبار فرمانا، پیڑوں میں کچھ پھل آئے، کچھ آنے کو ہیں، تو ایسی حالت میں موجودہ وآئندہ کل بہار کی بیع کو امام حلوانی وامام فضل وغیرہما کا جائز فرمانا اور خود شمار کتب کا محل ہی کیا ہے۔ قطع نظر اور مسائل سے یہی مسئلے اگر دیکھیں، تو مذہب کے عامہ متون وشروح وفتاوی میں سے کوئی کتاب ان سے خالی نہ پائیں، یہ اور ان کی امثال کثیرہ جن کے خرمن سے خوشہ ابحاث آتیہ میں بھی ان شاء اللہ العزیز آتا ہے، سب برخلاف اصل وقیاس ہیں، جنہیں ائمہ کرام وعلمائے اعلام نے تعامل وعرف پر مبنی فرمایا، اب کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ ان باتوں کا

تعامل زمانہ اقدس حضور پر نور سید عالم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم سے ہے۔

(فتاوی رضویہ، جلد19، صفحہ592، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

متعلقہ جزئیات:

فتاوی رضویہ میں ہے: "علم غیب عطا ہونا اور لفظ عالم الغیب کا اطلاق اور بعض اجلہ اکابر کے کلام میں اگرچہ بندہ مومن کی نسبت صریح لفظ یعلم الغیب وارد ہے کما فی مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح لملا علی القاری (جیسا کہ ملا علی قاری کی مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح میں ہے۔) بلکہ خود حدیث سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما میں سیدنا خضر علیہ الصلوۃ والسلام کی نسبت ارشاد ہے: کان رجلا یعلم علم الغیب۔ وہ مرد کامل ہیں جو علمِ غیب جانتے ہیں۔) مگر ہماری تحقیق میں لفظ عالم الغیب کا اطلاق حضرت عزت عزجلالہ کے ساتھ خاص ہے کہ اُس سے عرفاً علم بالذات متبادر ہے۔۔۔ **اور اس سے انکار معنی لازم نہیں آتا۔ حضور صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم قطعاً بے شمار غیوب وماکان مایکون کے عالم ہیں مگر عالم الغیب صرف اللہ عزوجل کو کہا جائے گا، جس طرح حضور اقدس صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم قطعاً عزت جلالت والے ہیں تمام عالم میں ان کے برابر کوئی عزیز وجلیل ہے نہ ہو سکتا ہے مگر محمد عزوجل کہنا جائز نہیں، بلکہ اللہ عزوجل ومحمد صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم۔ غرض صدق وصورت معنی کو جواز اطلاق لفظ لازم نہیں نہ منع اطلاق لفظ کو نفی صحت معنی۔**

امام ابن المنیر اسکندری کتاب الانتصاف میں لکھتے ہیں: "کم من معتقد لا یطلق القول بہ خشیۃ ایہام غیرہ مما لا یجوز اعتقادہ فلا ربط بین الاعتقاد والاطلاق "ترجمہ: بہت سے معتقدات ہیں کہ جن کے ساتھ قول کا اطلاق اس ڈر سے نہیں کیا جاتا کہ ان میں ایسے غیر کا ایہام ہوتا ہے جس کا اعتقاد جائز نہیں، لہذا اعتقاد اور اطلاق کے درمیان کوئی لزوم نہیں۔

یہ سب اس صورت میں ہے کہ مقید بقید اطلاق، اطلاق کیا جائے یا بلا قید علی الاطلاق مثلاً عالم الغیب یا عالم الغیب علی الاطلاق اور اگر ایسا نہ ہو، بلکہ بالواسطہ یا بالعطاء کی تصریح کر دی جائے، تو وہ محذور نہیں کہ ایہام زائل اور مراد حاصل ۔علامہ سید شریف قدس سرہ حواشی کشاف میں لکھتے ہیں:"وانما لم یجز الاطلاق فی غیرہ تعالیٰ لانہ یتبادر منہ تعلق علمہ بہ ابتداء فیکون تناقضا واما اذا قید وقیل اعلمہ اللہ تعالیٰ الغیب اواطلعہ علیہ فلا محذور فیہ "ترجمہ: علم غیب کا اطلاق غیر اللہ پر اس لیے ناجائز ہے کہ اس سے غیر اللہ کے علم کا غیب کے ساتھ ابتداء (بالذات) متعلق ہونا متبادر ہوتا ہے تو اس طرح تناقض لازم آتا ہے، لیکن اگر علم غیب کے ساتھ کوئی قید لگا دی جائے اور یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو غیب کا علم عطا فرما دیا ہے یا اس کو غیب پر مطلع فرما دیا ہے تو اس صورت میں کوئی ممانعت نہیں۔ملتقطا۔

(فتاوی رضویہ، جلد 29، صفحہ 403-404-405، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

تفسیر ابن کثیر میں ہے:"قال الجمھور من العلماء لا یجوز إفراد غیر الأنبیاء بالصلاۃ لأن ھذا قد صار شعارا للأنبیاء إذ ذکروا، فلا یلحق بھم غیرھم فلا یقال: قال أبو بکر صلی اللہ علیہ أو قال علي صلی اللہ علیہ، وإن کان المعنی صحیحا، کما لا یقال: قال محمد عز وجل، وإن کان عزیزا جلیلا لأن ھذا من شعار ذکر اللہ عز وجل "ترجمہ: جمہور علماء نے کہا کہ غیرِ انبیاء علیہم السلام کے لئے استقلالا درود پاک پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ یہ انبیاء کا شعار ہے، کہ جس وقت ان کا ذکر کیا جائے، تو ان کے ساتھ غیر کو نہیں ملایا جائے گا، تو یوں نہیں کہا جائے گا کہ **ابو بکر صلی اللہ علیہ نے کہا یا علی صلی اللہ علیہ نے کہا، اس کا معنی اگرچہ صحیح ہے جیسا کہ محمد عزوجل نے کہا نہیں کہا جائے گا اگرچہ نبی علیہ السلام عزیز و جلیل ہیں؛ کیونکہ یہ اللہ پاک کے ذکر کا شعار ہے۔**

(تفسیر ابن کثیر، جلد 06، صفحہ 422، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

المعتمد المستند میں ہے:"﴿ وَالَّذِیۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَلِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا

بِالۡاِیۡمَانِ﴾۔ أقول ولا يريد أن يذكرهم بالمغفرة عند ذكر أسمائهم وإن كان الأمر أن العبد وإن عظم ما عظم لا يستغني عن مغفرة الله تعالى ورحمته، ذلك لأن العرف يخص بعض الكلمات ببعض الحالات، والتجاوز عنه يعد سوء أدب، فلا يقال قال أبو بكر الصديق غفر الله تعالى له، أو علي المرتضى عفا الله تعالى عنه، بل رضي الله تعالى عنهما كما لا يقال: قال موسى أو عيسى رضي الله تعالى عنهما، بل صلوات الله وسلامه عليهما، كما لا يقال قال نبينا عز وجل، وإن كان قطعا عزيزا جليلا عزَّ بإعزاز ربه، فبلغ أقصى ما يمكن للبشر من الإعزاز، وجل بإجلال مولاه، فوصل منتهى ما يصح للخلق من الإجلال ولكن صلى الله تعالى عليه وسلم وربه عز وجل كل ذلك لمكان العرف الفاشي بين المسلمين "ترجمہ: (اور وہ جو اُن کے بعد آئے عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے)۔ میں (امام احمد رضا خان) کہتا ہوں کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کے ناموں کو ذکر کرتے وقت انہیں مغفرت کے ساتھ یاد کیا جائے، اگرچہ بندہ جتنا بڑا بھی بن جائے ،وہ اللہ پاک کی مغفرت ورحمت سے مستغنی نہیں ہو سکتا اور یہ اس وجہ سے ہے کہ عرف میں بعض کلمات بعض حالات کے ساتھ خاص ہوتے ہیں، تو اس سے تجاوز کرنے کو بے ادبی شمار کیا جاتا ہے، تو یوں نہیں کہا جائے گا کہ ابو بکر غفر اللہ تعالی لہ نے کہا یا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا، بلکہ رضی اللہ عنھما کہا جائے گا، جیسا کہ موسی یا عیسی رضی اللہ عنہ نہیں کہا جائے گا، بلکہ صلوات اللہ تعالی وسلامہ علیھما کہا جائے گا، یوں ہی یہ نہیں کہا جائے گا کہ ہمارے نبی عزوجل نے کہا اگرچہ نبی پاک علیہ السلام یقینا قطعا جلیل وعزیز ہیں کہ انہیں رب نے وہ عزت بخشی کہ جہاں تک بشر کے لیے جتنا بلند مقام ہو سکتا تھا، وہاں تک پہنچایا اور وہ اپنے مولی عزوجل کی جلالت کے صدقہ جلال کے اس مقام پر پہنچے، جہاں تک مخلوق کے لیے یہ ہو سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور رب عزوجل کہا جائے گا کہ یہ سب مسلمانوں کے مابین عرف کی وجہ سے لازم ہو گیا ہے۔ (المعتمد المستند، صفحہ 143، مطبوعہ رضا اکیڈمی، بمبئی)

قولہ:04

حلال اور حرام کرنے کا اختیار اللہ کو ہے۔ فرمایا: و احل اللہ البیع وحرم الربا. اللہ نے یہ اختیار اپنے حبیب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عطا فرمایا ہے۔ ارشاد: ﴿يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ (پارہ 09، سورۃ الاعراف، آیت 157)

اقول:

اس کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ پہلے تو یہ ثابت کیا جائے کہ حرام کہاں لکھا ہے؟ کیونکہ ہم نے ممانعت کا قول کیا ہے اور ممانعت و حرمت کے اطلاقات میں فرق ہے، خصوصا فنِ افتاء سے وابستگان اس سے واقف ہیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر سید سے کسی غیر سید نے وہی آلِ رسول ہونے کا دعوی کیا اور وہ شخص سید یعنی آل رسول نہیں ہے، تو یہ حرام ہی ہے، جسے ہم نے نہیں، بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کہا ہے، چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: " لیس من رجل ادعی لغیر ابیہ وھو یعلمہ الا کفرومن ادعی قوما لیس لہ فیھم نسب فلیتبوأ مقعدہ من النار " ترجمہ: جس شخص نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو اپنے والد کے علاوہ کی طرف منسوب کیا، تو اس نے کفر کیا اور جس نے اپنے آپ کو کسی ایسی قوم کی طرف منسوب کیا، جس میں اس کا نسب نہیں، تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

(صحیح البخاری، جلد 04، صفحہ 180، المطبعۃ الکبری الامیریۃ، بیروت)

یونہی سید نہ ہونے کی صورت میں خود کو سید کہنا، جھوٹ اور دھوکہ دہی کو بھی مستلزم ہے، جن کی حرمت میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔

قولہ:05

لہذا القول الفائق کے مولف سے اس مقام پر تین سوال ہیں۔ پہلا سوال: لفظ سید کا استعمال

اولاد فاطمہ میں بند ہے، اس کا حصر ہے، اس کا پہلے قرآن یا حدیث سے حوالہ پیش کریں۔ اجماع امت کا حوالہ دیں یا قیاس مستنبط من الثلاثہ پیش کریں۔ اگر حوالہ ہے تو پیش کریں اور 10 روپے انعام حاصل کریں۔ آپ کو پندرہ دن کی مدت دی جاتی ہے۔ اگر اصول اربعہ سے آپ کا دعوی ثابت نہیں اور یقیناً ثابت نہیں ہے تو "القول الفائق" سے اعلانیہ، زبانی تحریری توبہ کریں۔

اقول:

اوپر کثیر دلائل عرف کے حجت ہونے پر ذکر کر دیئے ہیں، جن میں قرآن و حدیث کے دلائل شامل ہیں اور عرف سے اس لفظ کی فاطمی اولاد میں تخصیص بھی ثابت ہے، تو اس سے ہمارا مدعی اور شرعی مسئلہ واضح ہو گیا ہے۔ اور عرف کا اعتبار شرع میں اس قدر ہے کہ بلاوجہ شرعی عرف وعادت قوم سے خروج بھی سبب شہرت وباعث کراہت ہے، اگرچہ اس شے کا ثبوت سنت سے ہو، جیسا کہ تہبند باندھنا سنت ہے، مگر جہاں اس کا عرف نہیں ہے اور لوگ اس پر انگلیاں اٹھا سکتے ہیں، تو وہاں اس کا باندھنا منع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ فتاوی رضویہ میں ہے: "اور فی نفسہٖ دھوتی کی حالت کو دیکھا جائے، تو اس کی اپنی ذات میں کوئی حرج شرعی بھی نہیں، بلکہ ساتر ماموربہ کے افراد سے ہے، اصل سنت ولباس پاک عرب یعنی تہبند سے صرف لٹکتا چھوڑنے اور پیچھے گھرس لینے کا فرق رکھتی ہے، اس میں کسی امر شرعی کا خلاف نہیں، تو دو وجہ ممانعت تو قطعاً منتفی ہیں۔ رہا خاص شعار کفار ہونا، وہ بھی باطل۔ بنگالہ وغیرہ پورب کے عام شہروں میں تمام سکان ہندو مسلمان سب کا یہی لباس ہے۔ یوہیں سب اضلاع ہند کے دیہات میں ہندو مسلمین یہی وضع رکھتے ہیں۔ رہے وسط ہند کے شہری لوگ، ان میں بھی فنائے شہر اور خود شہر کے اہل حرفہ وغیرہم جنہیں کم قوم کہا جاتا ہے بعض ہر وقت اور بعض اپنے کاموں ضرورتوں کی حالت میں دھوتی باندھتے ہیں۔

ہاں یہاں کے معزز شہریوں میں اس کا رواج نہیں، مگر اس کا حاصل اس قدر کہ اپنی تہذیب کے

خلاف جاتے ہیں نہ یہ کہ جو باندھے اسے فعل کفر کا مرتکب سمجھیں، تو غایت یہ کہ ان اضلاع کے شہری وجاہت دار آدمی کو گھر سے باہر اس کا باندھنا مکروہ ہو گا کہ بلاوجہ شرعی عرف وعادت قوم سے خروج بھی سبب شہرت وباعث کراہت ہے۔ علامہ قاضی عیاض مالکی، امام اجل ابوزکریانووی شافعی شارحان صحیح مسلم پھر عارف باللہ سیدی عبدالغنی نابلسی حنفی شارح طریقہ محمدیہ فرماتے ہیں: خروجه عن العادة شهرة ومكروه۔ عادت اور عرف کی خلاف ورزی مکروہ اور باعث شہرت ہے۔

اور اگر وہاں کے مسلمان اسے لباس کفار سمجھتے ہوں، تو احتراز مؤکد ہے، حرج پیچھے گھرسنے میں ہے، ورنہ تہبند تو عین سنت ہے۔ اس سے زائد جو کچھ لفّاظیاں شخص مذکور نے کہیں محض بے اصل وباطل اور حلیہ صدق وصواب سے عاطل ہیں، بالفرض اگر دھوتی باندھنا مطلقاً ممنوع بھی ہوتا، تاہم اس میں اُتنا وبال نہ تھا جو شرع مطہر پر دانستہ افترا کرنے میں۔

(فتاوی رضویہ، جلد24، صفحہ534-535، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

بلکہ اس سے بھی واضح دلیل لیں کہ حدیث سے عدمِ جواز ثابت ہے، مگر اس کے باوجود عرف و تعامل کی وجہ سے فقہاء کرام نے جواز کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ، امام اہل سنت، امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ تعالی علیہ لکھتے ہیں: "بٹائی پر زمین اٹھانے سے احادیث صحیحہ معتبرہ میں منع وارد، یہاں تک کہ حدیث جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالٰی عنہما میں ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کو فرماتے سنا: من لم یذر المخابرۃ فلیؤذن بحرب من اللہ ورسولہ۔ رواہ ابوداؤد والطحاوی وفی الباب عن رافع بن خدیج وثابت بن الضحاک وزیدبن ثابت وانس بن مالک وابی ہریرۃ رضی اللہ تعالٰی عنہم اجمعین۔ جو بٹائی نہ چھوڑے وہ اللہ ورسول سے لڑائی کا اعلان کرے (اسے ابوداؤد اور طحاوی نے روایت کیا، اور اس باب میں رافع بن خدیج اور ثابت بن ضحاک اور زید بن ثابت اور انس بن مالک اور ابی ہریرہ رضی اللہ تعالٰی عنہم اجمعین نے روایت کیا۔

اور قیاس بھی بوجوہ کثیرہ اسی کا مساعد۔ ولہذا ہمارے امام رضی اللہ تعالٰی عنہ باتباع جماعت صحابہ وتابعین محرمین مانعین حرام وفاسد جانتے ہیں بایں ہمہ صاحبین نے بوجہ تعامل اجازت دی اور اسی پر فتوٰی قرار پایا۔ (فتاوی رضویہ، جلد19، صفحہ602، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

قولہ:06

دوسرا سوال: جب لفظ سید کی تخصیص اولاد فاطمہ میں ہے ہی نہیں، تو آپ کو سید لغوی اور اصطلاحی کی تقسیم کرنے کی کیا حاجت پڑ گئی؟ اس کی ذرا وضاحت کریں۔

اقول:

کسی بھی عاقل شخص پر مخفی نہیں ہے کہ جہاں کہیں کوئی لفظ مختلف معانی میں استعمال ہو، تو وہاں ان چیزوں کی حاجت پڑتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو مختلف مقامات میں مختلف الفاظ کا استعمال ہی ناممکن ہو جائے کہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ یہ کس معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصطلاحیں مرتب ہوتی رہتی ہیں اور انہیں لغوی معنی سے جدا کر کے بیان کیا جاتا ہے۔ سادہ سی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں کہ

1. صلاۃ کا لغوی معنی دعا ہے اور اصطلاحی معنی نماز ہے اور اس لفظ کی بھی نماز کے ساتھ تخصیص ثابت نہیں، بلکہ قرآن و حدیث میں یہ لفظ دعا، درود اور نماز وغیرہ کئی معانی میں استعمال ہوا ہے، تو کیا ہم نماز کے وقت دعا کر کے فارغ الذمہ ہو سکتے ہیں کہ صلاۃ کا لغوی معنی دعا ہے اور وہ ہم نے کر دی۔ تو آپ کا جواب ہو گا کہ نہیں، ہرگز نہیں۔ تو ایسے ہی یہاں بھی لغوی اور اصطلاحی معنی کے فرق کو سمجھا جائے کہ ہر جگہ لغوی معنی کا اطلاق اور اس کے مطابق عمل درست نہیں ہوتا۔
2. "پاکستان" کا لغوی معنی پاک سرزمین ہے، لیکن اصطلاح میں اس سے وطنِ عزیز مراد ہوتا ہے۔ تو اگر کہیں یہی لفظ سو ممالک کی لسٹ میں لکھا ہو، تو کیا اس جگہ ہر بندہ جس کی زمین

پاک ہو، وہ جاکر دعوی کر سکتا ہے؟ اگرچہ وہ کسی ملک سے ہو کہ یہ میرا تذکرہ ہے، نہیں، ہر گز نہیں۔ کیونکہ وہاں اس سے ملکِ پاکستان مراد ہوتا ہے۔

3. قرآن کا لغوی معنی "پڑھا ہوا" یا "جسے بار بار پڑھا جائے" تو کیا اس لغوی معنی کا اعتبار کر کے ہم ہر کتاب کو قرآن کہہ دیں۔ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن عرف عام میں اللہ کی آخری نازل کردہ کتاب کے ساتھ خاص ہے۔

امید ہے کہ سمجھنے کے لیے یہ کافی ہو گا۔

قولہ:07

تیسرا سوال: یہ جو آپ نے لکھا ہے، سید القوم جائز ہے۔ سید نا جائز ہے۔ یہ جو ہمارے عرف میں سید کی بغیر اضافت کے دیگر لوگوں کے لیے کہنے کی ممانعت ہے۔ یہ ممانعت کہاں سے آئی۔ مانع کون ہے۔ من ھو المانع؟ یہ ریسرچ سنٹر مانع ہے؟ جبکہ قرآن مجید میں حضرت یحیی علیہ السلام کے لئے لفظ سید بے اضافت کے اللہ تعالیٰ نے استعمال فرما کر ریسرچ سنٹر پر کاری ضرب لگا دی۔ فرمایا: سیدا و حصورا و نبیا من الصالحین، لہذا آپ کا منع کرنا خلاف قرآن ہے۔

اقول:

یہ اضافت قرآن و حدیث سے آئی ہے۔ اور اس پر بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

1. مثال کے طور پر کسی بندے کو مطلق "رب" کہنا جائز نہیں کہ یہ اللہ پاک کے ساتھ خاص ہے، حالانکہ اس کا معنی پالنے والا ہے، تو ماں باپ بھی پالنے والے ہوتے ہیں، تو ان کو کہنا جائز ہونا چاہیے، مگر یہ حرام ہے۔ اس کے بر خلاف بندے کو اضافت کے ساتھ "رب المال" یا "رب الدار" وغیرہ کہنا جائز ہے۔ یونہی والد کو "رب الاسرۃ" یعنی خاندان کا مالک و سرباری

کہنا جائز ہے۔ کیونکہ یہاں سیاق وسباق سے یہ رب تعالی والے اطلاق سے جدا ہو گیا۔

2. لفظِ خدا کا کسی غیر اللہ پر اطلاق کفر ہے، جبکہ جہاں اضافت کے ساتھ ہو، تو جائز ہے جیسا کہ کشتی چلانے والے کو "ناخدا" کہتے ہیں۔

3. لفظِ صحابی کا لغوی معنی ساتھی اور دوست وغیرہ ہے، جبکہ اصطلاح میں اس سے مراد وہ ہستی ہے جس نے بیداری کی حالت میں نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی زیارت کی ہو، ان پر ایمان لانے کی سعادت حاصل کی ہو اور ایمان کی حالت میں ہی وفات پائی ہو۔ اب اگر یہاں آپ کا اصول دیکھیں کہ جیسے "سید" کا عربی میں اضافت کے ساتھ دیگر پر اطلاق آیا ہے، اس سے ساری دنیا میں سید کا عموم مانیں، تو پھر ہر شخص کا خود کو حضور علیہ السلام کا صحابی کہنا بھی جائز و درست ہو جائے گا؛ کیونکہ ہر مسلمان حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ساتھی ہے، حالانکہ یوں سب کو صحابیِ رسول کہنے کی اجازت نہیں کہ اس میں صحابہ پر عرف کی تخصیص کا ابطال ہے۔ ہاں اگر کوئی اضافت ہو یا سیاق وسباق واضح ہو تو وہاں حرج نہیں۔

4. ولی کا لغوی معنی مددگار، دوست ہے، اور اصطلاح میں اللہ پاک کا محبوب بندہ جسے وہ خاص مرتبہ عطا کرتا ہے، لیکن قرآن وحدیث میں کئی مقامات پر عام مسلمانوں پر بھی ولی کا اطلاق آیا ہے، مگر عرف وشرع میں، چونکہ ولی ایک خاص اصطلاح میں استعمال ہوتا ہے، تو اب اگر ایک عام فاسق وفاجر شخص ولی ہونے کا دعوی کرے، تو کیا لوگ اس بارے میں چہ می گوئیاں نہیں کریں گے؟ کیا خود کو محلِ تہمت پر پیش کرنا جائز ہے؟

امید ہے کہ یہ مثالیں مع وضاحت کافی ہوں گی، وگرنہ پیش کرنے کو اس طرح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

قولہ:08

ایسے عرف کی کوئی حیثیت نہیں۔ جو عرف خلاف قرآن ہو، وہ مردود ہے۔

اقول:

پہلے قرآن کے خلاف ثابت کریں تو سہی، کیا آپ کے نزدیک صرف لغوی معنی میں آجانا یا کسی خاص معنی میں آجانا کافی ہے؟ تو پھر قرآن میں صلوۃ کا لفظ بھی دعا اور درود کے معنی میں آیا ہے، تو کیا نماز کو چھوڑ کر سب جگہ یہی دعا والا اطلاق کر دیں۔ قرآن کے خلاف نہیں، بلکہ مطابق ہے، جیسا کہ پہلے مثالیں دی جاچکی ہیں۔

قولہ:09

عرف کا اصول اربعہ میں کوئی ذکر اور درجہ نہیں۔

اقول:

یہ بھی آپ کی جہالت کی دلیل ہے، کیونکہ یہ اصول اربعہ میں شامل ہے اور یہ قیاس خفی جسے استحسان و مصلحت مرسلہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان اصولِ اربعہ ہی کے تحت آتا ہے، نور الانوار، حسامی وغیرہ کو دوبارہ اچھی طرح پڑھیں۔

قولہ:10

اجماع امت اور قیاس صحیح بھی کتاب و سنت کو منسوخ نہیں کر سکتے۔ نور الانوار کے متن (المنار) میں مرقوم ہے۔ والقیاس لا یصلح ناسخاً۔ قیاس کسی اصل کے لیے ناسخ نہیں ہو سکتا۔ جب قیاس کتاب اور سنت کے لیے ناسخ نہیں ہو سکتا، تو عرف کتاب و سنت کے لیے کیسے ناسخ ہو سکتا ہے؟ حتی کہ المنار والے نے لکھا اجماع بھی کتاب و سنت کے لیے ناسخ نہیں ہو سکتا۔ جب کتاب اللہ میں لفظ سید، سیدہ فاطمہ کی اولاد کے علاوہ استعمال ہو گیا، تو آپ عرف کے ذریعے کیسے تخصیص کر سکتے ہیں؟ لیس لك من الاختیار ان تبدل حکم الکتاب ولا ان تخصص عموم الکتاب۔ ملتقطا

اقول:

حضرت آپ نے شاید اپنے کلام کو مکمل پڑھا نہیں ہے۔اوپر آپ ثابت یہ کرتے آ رہے ہیں کہ اجماع اور قیاس قرآن و حدیث کے لیے ناسخ نہیں ہوسکتے اور آخر میں نتیجہ یہ نکال رہے ہیں کہ آپ عرف کے ذریعے کیسے تخصیص کر سکتے ہیں؟

حضرت مجتہد صاحب! کیا آپ کو تخصیص اور تنسیخ کے معانی کا فرق بھی معلوم ہے یا ویسے ہی لکھنے بیٹھ گئے ہیں۔سید کا خاص معنی میں استعمال کسی بھی چیز کا نسخ نہیں، بلکہ یہ تخصیص ہے اور عرف سے مسائل میں تخصیص کی جاسکتی ہے، اس پر اشباہ وغیرہ کتب میں بیسیوں تصریحات موجود ہیں۔بلکہ تنسیخ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ صحاح ستہ میں احادیث موجود ہیں کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جوتے پہن کر مسجد جاتے تھے اور انہی میں نماز پڑھتے تھے، مگر اب ہمارے عرف میں اس کو بے ادبی سمجھا جاتا ہے، تو اس کی اجازت نہیں ہے۔

فتاوی رضویہ میں ہے: "صدہا سال سے عرف عام ہے کہ استعمالی جوتے پہن کر مسجد میں جانے کو بے ادبی سمجھتے ہیں ائمہ دین نے اُس کے بے ادبی ہونے کی تصریح فرمائی، امام برہان الملۃ والدّین صاحب ہدایہ کی کتاب التجنیس والمزید اور محقق بحر زین ابن نجیم کی بحر الرائق اور فتاوٰی سراجیہ اور عالمگیریہ جلد پنجم صفحہ 122 کتاب الکراہۃ باب خامس میں ہے: دخول المسجد متنعلا مکروہ (مسجد میں جوتا پہن کر داخل ہونا مکروہ ہے۔ آج اگر کسی نواب کے دربار میں آدمی جُوتا پہنے جائے، تو بے ادب ٹھہرے، نماز اللہ واحد قہار کا دربار ہے، مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلنا اور اُن میں فتنہ وفساد پیدا کرنا اور انھیں نفرت دلانا قرآنِ عظیم واحادیث صحیحہ کے نصوص قاطعہ سے حرام اور سخت حرام ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(فتاوی رضویہ، جلد06، صفحہ634، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

حضرت اگر منسوخ نہیں کرنا چاہتے تو ذرا محلے کی مسجد میں جوتے پہن کر جائیں اور ممبر پر لوگوں کو

جوتے پہن کر جانے والی حدیث بتا کر ان سے اس حدیث پر عمل کروائیں، تو آپ کو لگ پتہ جائے گا۔

مزید ملاحظہ فرمائیں کہ یہاں پاک و ہند میں لڑکیوں کے ختنے سے عرف نہ ہونے کے سبب بچا جا رہا ہے حالانکہ اس کا بھی شرعاً حکم ہے اگرچہ تاکیدی نہیں۔ چنانچہ فتاوی رضویہ میں ہے: "لڑکیوں کے ختنہ کرنے کا تاکیدی حکم نہیں اور یہاں پاک و ہند میں رواج نہ ہونے کے سبب عوام اس پر ہنسیں گے اور یہ ان کے گناہِ عظیم میں پڑنے کا سبب ہو گا اور حفظِ دینِ مسلمانان واجب ہے۔ لہذا یہاں (پاک و ہند میں) اس کا حکم نہیں۔" (فتاوی رضویہ، جلد22، صفحہ684، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

اسی طرح متعدد آئمہ نے عمامے کا شملہ نہ چھوڑنے کا مسئلہ بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ بھی سنت سے ثابت ہے، تو جہاں عرف و رواج خلاف پر ہو اور اس سے جگ ہنسائی اور خلاف شرع امور کا ارتکاب ہونے کا اندیشہ ہو، تو وہاں ان چیزوں کا ترک ہی شریعت کو مطلوب ہوتا ہے۔ تو ایسے ہی اگر یہاں سب کو سید کہنے کی اجازت دیدی گئی، تو لوگ چہ می گوئیاں اور اعتراضات کریں گے اور بعض جھوٹے سید ہو کر خود کو اصلی دکھائیں گے اور لغوی معنی کی آڑ میں نذرانے بٹورنے کے لیے پیر خانے کھول لیں گے، جس سے کئی مفاسد کا دروازہ کھل جائے گا، لہذا اس وجہ سے یہاں پاک و ہند میں سید کو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فاطمی اولاد کے لیے ہی استعمال کیا جائے، ان کے علاوہ دیگر ہاشمیوں کے لیے اس لفظ کے مطلق استعمال سے بچنا لازم ہے۔ "تلک عشرة کاملة۔"

یہ سب اختصاراً، کم جزئیات کے ذکر، بلکہ کئی جگہوں پر فقط مسائل کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہوئے لکھا ہے، کیونکہ جزئیات نکالنے اور لکھنے میں وقت لگتا ہے اور ویسے بھی بعض عمومی مسائل تھے جنہیں تھوڑا بہت مطالعہ رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے، تو اس وجہ سے ان مسائل کے جزئیات کو یہاں تحریر نہیں کیا گیا، مگر ضرورت پڑنے پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اگر آپ کے ان چھ صفحوں کا باریک بینی سے جائزہ لے کر تفصیلی رد لکھا جاتا، تو بلا شبہ اس میں اس کے علاوہ بھی بیسیوں غلطیاں موجود ہیں، جن میں سے چند کا نظارہ

آپ نے دیکھ ہی لیا ہو گا۔ ہماری طرف سے یہ اس سلسلے کی آخری تحریر ہے۔شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات۔

علاوہ ازیں ہمارے پاس کرنے کو مزید بہت سارے کام پڑے ہیں، تو ان ضروری کاموں کی طرف توجہ چاہتے ہیں۔والسلام

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــــــہ

علمـــائے دارالافتـــاءافکارِرضـــا

